مولانا محمد جعفر تھانیسری

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک نمائندہ لیکن گمنام مجاہد

وسیم احمد سعید

B-168، سیکٹر 14، نوئیڈا، ضلع گوتم بدھ نگر، یوپی، موبائل: 9811123575

مجھ کو بھلا سکوگے نہ تم اہلِ گلستاں
ٹوٹا ہوا میں پھول تمہارے چمن کا ہوں

قارئین نے اکثر ان سرفروشانِ وطن کے حالات کا مطالعہ کیا ہوگا جن کے ناموں سے دنیا عموماً آشنا ہے، لیکن زیرِ نظر مضمون میں ۱۸۵۷ء کے ایک ایسے مجاہد کے حالات پیش کئے جارہے ہیں جس کا نام شاید کبھی ہی کبھی منظرِ عام پر آیا ہو حالانکہ وہ صفِ اول کا مجاہد تھا۔ وہ خلوص، سرگرمیٔ عمل، استقامت، جذبۂ جانفشانی، بہادری، استقلال اور صبر و تحمل میں نامور مجاہدین سے ہوسکتا ہے سبقت نہ لے پایا ہو لیکن وہ کبھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے کسی بھی محاذ پر پیچھے نہیں رہا لیکن افسوس کہ اس کا نام گمنامی کا شکار ہوگیا حالانکہ تاریخ کے دیمک زدہ اوراق پارینہ میں مادرِ وطن کے اس قابل فخر فرزند کو مولانا محمد جعفر تھانیسری کے نام سے تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بقول شاعر:

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
اُڑا کے لے گئی جس کا ہوا ورق ایک ایک

اس لئے اس مردِ مجاہد کی داستانِ حیات مکمل کرنے کے لیے صحرانوردی یادشت وصحرا کی آوارہ گردی بھی کسی قلمکار کے لیے مددگار و معاون ثابت نہیں ہوسکتی۔ پتہ نہیں اس تلخ حقیقت کو مؤرخین کی زیادتی کہا جائے یا ناانصافی کہ انھوں نے مولانا صاحب جیسے عظیم مجاہد کو کیوں نظر انداز کیا جو ایسا مستحق تھا کہ تاریخ خود اپنے دامن میں اُسے ایک زریں مقام عطا کرے جو مولانا کے لیے بہترین نذرانہ عقیدت ہوسکتا تھا۔

اس پس منظر کے باوجود زیرِ نظر مضمون میں ''کچھ یہاں سے کچھ وہاں سے'' کو قلم کی مشعل راہ بنا کر کوشش کی گئی ہے کہ قارئین کو ان کی حیات اور کارناموں سے کسی حد تک متعارف کرایا جاسکے۔ یہ سعی پھر بھی معلومات کے لحاظ سے تشنہ ہی قرار دی جائے گی۔ بہرحال مولانا سے متعلق دستیاب یا فراہم شدہ تفصیلات قارئین کی خدمت میں مختصراً پیش ہیں۔

مولانا محمد جعفر تھانیسری ضلع کرنال واقع موجودہ صوبۂ ہریانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں مؤرخین خاموش ہیں لیکن قیاس کے مطابق ان کا سال پیدائش ۱۸۳۷ء قرار دیا گیا ہے جیسا کہ ہنٹر کی کتاب سے بھی خلاصہ ہوتا ہے کہ ان کی عمر تقریباً ۱۲ ہی سال کی تھی کہ ان کے والد ''میاں جیون'' کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کا چھوٹا بھائی محمد سعید محض ۶ مہینہ کا تھا۔

مولانا کا ایک غریب گھرانے سے تعلق تھا لہٰذا یہ اپنے بچپن کے ابتدائی بارہ برس ناخواندہ ہی رہے اس کے بعد خود بخود تعلیم کا شوق پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں کچھ کتابیں پڑھ کر تقریباً ۱۸۵۶ء میں عرض نویس کے درجہ تک پہنچ گئے۔ وکیلوں، عرائض نویسوں اور دیگر اہمیت رکھنے والوں کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے اس قدر کمال حاصل کرلیا کہ وکلا قاعدوں، ضابطوں اور قانونوں میں ان سے باقاعدہ مشورہ لینے لگے جس کی وجہ سے ان کو شہرت کے علاوہ کثیر آمدنی بھی حاصل ہوئی اور انھوں نے تھانیسر میں اچھی خاصی جائیداد پیدا کرلی۔

مولانا کی شادی پانی پت میں ہوئی تھی اور ان کو خدا نے دو بیٹے اور ایک بیٹی عطا کئے۔ بڑے بیٹے کا تو انتقال اسی دوران ہوگیا تھا جب وہ کالا پانی میں اسیرانہ زندگی گزار رہے تھے، لیکن چھوٹا بیٹا، بیٹی اور ان کی اہلیہ ان کی رہائی کے وقت زندہ تھے جو ۱۸۸۳ء کا زمانہ تھا لہٰذا جب مولانا رہائی کے بعد واپس وطن پہنچے تو بیوی بچوں کے ساتھ ایک طویل عرصہ کی جدائی کے بعد بوقت ملن یا ملاقات جذبات کا کیا عالم رہا ہوگا یہ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کیونکہ یہ بیان نہیں کیا جاسکتا حالانکہ مولانا ہندستانی بیوی کے لیے ایک عدد سوکن اور ۸ بچوں کا تحفہ لے کر آئے تھے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ابتدائی دور میں مولانا اپنے ۱۰ ساتھیوں کے ہمراہ دہلی گئے تھے اور جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نظریاتی اور عملی دونوں طریقوں سے جنگ میں شریک ہوئے تو غلط نہ

ہوگا۔ وہ باقاعدہ لڑائیوں میں بھی شامل رہے لیکن دہلی میں ناکامی کے بعد وہ اپنے وطن تھانیسر واپس چلے گئے تھے اور پھر وہاں انھوں نے جنگ کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور سارے ملک کا دورہ شروع کیا۔

یہاں پر یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ مولانا سید احمد شہید کے معتقد اور مُرید ہی نہیں تھے بلکہ ان کی تحریک آزادی کی تنظیم کے ایک سرگرم رکن بھی تھے جس کو وہابی تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جس کا ایک بہت بڑا مرکز عظیم آباد (پٹنہ) ہوا کرتا تھا جہاں صادق پور کا مقام ان مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا۔ اس تنظیم کے اراکین کا سید احمد شہید کی قیادت میں سرحد پر آزادی کے لیے ہونے والی جنگوں کے واسطے ہر قسم کی رسد کمک اور رقم حاصل اور فراہم کرنا اور پھر محاذِ جنگ تک پہنچانا انتہائی اہم فریضہ ہوا کرتا تھا جس میں مولانا اپنے علاقہ میں یقیناً ایک سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے اور اس تعلق سے مختلف مراکز و مقامات سے دیگر رفقا کے ساتھ ان کی خفیہ خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک کٹّر وہابی تھے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لحاظ سے جنگ آزادی کے لیے ان کی ساری سرگرمیوں کے پیچھے جذبۂ جہاد ہی کارفرما تھا۔

وہابی ہو یا وہابی تحریک یا اس سے وابستہ ہر شخص کا، اس جماعت کا واحد مقصد محض آزادی تھا جس کے لیے ظاہر ہے جنگ ہو یا تصادم یہ سبھی انگریزوں سے ہی نبرد آزما تھے لہٰذا فرنگیوں کے لیے یہ کوئی پوشیدہ تحریک نہیں تھی۔ وہ بخوبی واقف تھے اور ہر وقت ہر لمحہ اس کی سرکوبی کے لیے کوشاں بھی رہتے تھے اور انھوں نے ہر ممکنہ مقام پر اپنے مخبر اور جاسوس چھوڑ رکھے تھے جن کی اس دورِ خونچکاں میں کمی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود لفظ ''وہابی'' سے وہ بہت خائف رہتے تھے۔ یہ لفظ سنتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا جیسے دوسری عالمی جنگ کے دوران لوگ ''سواستک'' کا نشان ہی دیکھ کر خوفزدہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس لیے فرنگیوں کو مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ ہر داڑھی والے سے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ بھی پوری توجہ اور ہوشیاری سے وہابی مجاہدین کے خلاف اپنا جال بچھائے ہوئے تھے جس میں تلاشیاں اور چھاپے بھی شامل تھے۔ مولانا بھی ایسی ہی تلاشیوں میں حکومت کے ہاتھ آئے تھے لیکن اس سے قبل کہ وہ گرفتار کئے جاتے وہ بیوی بچوں اور دیگر افرادِ خانوادہ کے مشورے پر ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو تھانیسر سے فرار ہوئے لیکن انگریزوں نے ان کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ تھانیسر میں ظالم انگریزوں نے ان کی ضعیف والدہ اور چھوٹے بھائی محمد سعید پر بہت تشدد کیا اور ان کی اہلیہ کو بھی گرفتار کرنا چاہا لیکن وہ بچ گئیں۔ بدقسمتی سے چھوٹا بھائی تشدد نہیں برداشت کر سکا اور اس نے اگل دیا کہ مولوی صاحب دہلی میں ہیں۔ انگریزوں نے مولانا کی گرفتاری کے لئے مبلغ دس ہزار روپے کے انعام کا اعلان بھی کیا تھا۔

الغرض مولانا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے رہے اور انگریز دوڑتے رہے اور بالآخر ایک روز ان کو علی گڑھ میں گرفتار کر لیا گیا۔ ''روز ماپرسن'' اور ڈی جی آئی ''میجر نکفیل'' نے تشدد کا ریکارڈ توڑ دیا جس کو ضبط تحریر میں لانے سے قلم بھی قاصر ہے۔ لالچ بھی دیا اور ہر طرح سے مولانا سے ان کے ساتھیوں کے نام پوچھنا چاہے۔ سرکاری گواہ بنا کر چھوڑ دینے کا وعدہ بھی کیا لیکن مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے اور کسی بھی قسم کا راز افشا نہیں کیا۔ تشدد کا یہ عالم تھا کہ مولانا کا ایک ملازم عباس جو مولانا کے ساتھ تھا وہ بیچارہ فرنگی تشدد کی وجہ سے ہی موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔ یقیناً مولانا کا صبر و تحمل اور استقلال داد کا مستحق ہے۔

مولانا پر اپریل ۱۸۶۴ء میں مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف ''سرگزشت مجاہدین'' میں مقدمہ کی کارروائی کے بارے میں کافی تفصیلات اور معلومات رقم کی ہیں۔ یہاں اختصاراً اتنا ضرور لکھا جا سکتا ہے کہ ان کے خلاف تقریباً ۵۰ مولویوں کو بطور گواہ پیش کیا گیا۔ چھوٹے بھائی محمد سعید کو بھی پھانسی کی دھونس دے کر ان کے خلاف گواہی دینے پر مجبور کیا گیا۔ المختصر ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو مولانا کو سزائے موت سنا دی گئی لیکن ۱۹ ستمبر ۱۸۶۴ء کو سزائے موت کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں تبدیل کر دیا گیا اور ان کی داڑھی اور بال تراشنے کے بعد کالے پانی یعنی جزائر انڈمان نکوبار بھیج دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں مولانا کو بحکم لارڈ وائسرائے ہند رہا کر دیا گیا یعنی تقریباً ۱۸۔۲۰ سال قید میں گزارنے کے بعد انھیں ایک نئی زندگی عطا ہوئی۔

رہائی کی اطلاع سب سے پہلے ان کی ہندستانی بیوی کو پانی پت پہنچی جب کہ ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو رہائی نامہ انڈمان پہنچا، لیکن مولانا پہلے اپنی انڈمان والی اہلیہ کی رہائی کے انتظار میں بہ اجازت افسران بالا انڈمان ہی میں مقیم رہے اور انھوں نے اپنا ساز و سامان بھی فروخت کیا جب کہ وہ اپنا مکان وقف کر کے مسجد بنوا دینا چاہتے تھے لیکن اجازت نہیں ملی۔ اسی درمیان ان کی اہلیہ کا رہائی نامہ بھی آ گیا اور مولانا ایک بڑے کنبے کے ساتھ بمع مبلغ آٹھ ہزار روپیہ نقد ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو ۱۷ سال اور ۱۰ مہینے انڈمان میں رہنے کے بعد وطن کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۳ نومبر کو کلکتہ پہنچے جہاں دو دن کے قیام کے بعد دوبارہ رختِ سفر باندھا اور الٰہ آباد، کانپور، علی گڑھ اور سہارنپور ہوتے ہوئے ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء کو آخرش انبالہ پہنچ گئے اور اس طرح ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو تھانیسر سے فرار ہونے والے

مولانا کو کم وبیش ۲۰ سال کے بعد وطن عزیز میں سانس لینا نصیب ہوئی۔

مولانا پر دراصل آلام ومصائب کا آغاز ان کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی سے جاری ہوگیا تھا۔ ان کی تکلیفوں، مصیبتوں اور ان پر کئے جانے والے فرنگی ظلم وتشدد کی داستان انتہائی دردناک ہے جس کی شروعات علی گڑھ سے ہی ہوگئی تھی۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں حوائج ضروریات کا مسئلہ ننگے پیر پیدل سفر، کبھی بیل گاڑی پر، کبھی بھوکے پیاسے، کبھی اس جیل میں تو کبھی دوسری جیل میں اوپر سے انگریزوں کا ظلم وستم۔ انبالہ میں مقدمہ کی پریشانیاں اور دشواریاں پھر سزا کے بعد روانگی انڈمان تک مختلف مقامات کی جیلوں میں قید وبند کی کلفتیں جو بحری سفر میں بھی انڈمان پہنچنے تک قائم رہیں۔ یہ رونگٹے کھڑی کردینے والی ایسی طویل کہانی ہے جسے قلمبند کرنے کے لئے قلم بھی متکلف ہے۔

الغرض مولانا ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو کالا پانی پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ دیگر قیدیوں کے علاوہ مولانا یحییٰ اور میاں عبدالغفار بھی تھے۔ یہاں آمد پر قدرے ان کو سکون کی سانس نصیب ہوئی کیونکہ سید اکبر زماں (جو پہلے سے ہی وہاں موجود تھے) کی کوشش سے چیف کمشنر کی کچہری میں مولانا کو ''محرر'' یا نائب میر منشی کے طور پر مقرر کردیا گیا جس کی وجہ سے رہنے کو گھر اور خدمت کے لیے ایک نوکر بھی مل گیا۔ لہٰذا کالا پانی جیسے مقام پر اسیر ہونے کے باوجود مولانا کو کسی قدر اطمینان حاصل ہوا حالانکہ اپنوں سے جدائی اور جلاوطنی کا دکھ ان کو تارہائی جھیلنا پڑا۔

مولانا نے پہلے تو اپنی اہلیہ کو وطن سے بلانے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی لہٰذا مجبوراً ایک کشمیری برہمن خاتون سے کلمہ گو بنانے کے بعد نکاح کرلیا۔ یہ بیچاری ایک بلائے ناگہانی میں پھنس کر قید کے لیے کالے پانی پہنچی تھی۔ بدقسمتی سے یہ خاتون مولانا کا زیادہ دن ساتھ نہ دے سکی اور ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو عدم آباد کے لیے رخصت ہوگئی جس کے بعد مولانا نے دوسری مرتبہ الموڑہ کی ایک برہمنی سے عقد کرلیا۔ اس بدقسمت کو خاندانی عداوت کی وجہ سے ایک قتل میں ماخوذ کرکے کالے پانی کی سزا دلوادی گئی تھی۔ مولانا نے اسے بگوش اسلام بنایا اور پھر اپنے نکاح میں داخل کیا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ مولانا کے نکاح میں آنے والی دونوں ہی خواتین برہمن تھیں اور ان کا تعلق بھی پہاڑی علاقوں سے تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وادیٔ ظلمات (انڈمان) میں رفتہ رفتہ ایسی شادیاں ہونے لگی تھیں بلکہ تقریباً عام ہوگئی تھیں ان سے چلنے والی نسل کو آج بھی وہاں (Borns Local) کہا جاتا ہے۔ قصہ مختصر مولانا کی یہ منکوحہ کافی زرخیز ثابت ہوئی کیونکہ اس نے مولانا کو کثیر الاولاد بنادیا جیسا کہ پہلے مختصراً بیان کیا جاچکا ہے۔

رہائی کے بعد کے حالات کی تفصیل زیادہ دستیاب نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ مولانا کا ایک شاگرد کیپٹن ٹمپل انبالہ کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے اپنی ضمانت دے کر مولانا کے لیے سکونت انبالہ کی اجازت دلوادی۔ یہ ایک خداداد موقع تھا جس کا مولانا نے پورا فائدہ اٹھایا۔ ٹمپل نے اپنی طرف سے بیس روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کردیا تھا۔ اس کے علاوہ تقریباً ۳۰ روپیہ مولانا کو انگریزوں کو پڑھانے سے مل جاتے تھے۔ لہٰذا جب تک کیپٹن ٹمپل انبالے میں رہا مولانا کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی لیکن ٹمپل کے تبادلے کے بعد مولانا پر پابندیاں بڑھادی گئیں جس سے ان کی پریشانیوں میں اضافہ ضرور ہوا لیکن فروری ۱۸۸۸ء میں حکومت نے خود بخود تمام پابندیاں اٹھالیں اور وہ ایک پرسکون اور باعزت زندگی گزارنے لگے۔ مسلمان اور اہل ہنود ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

مولانا علم وادب کے علمبردار تو نہیں تھے لیکن ایک اچھے قلمکار ضرور تھے۔ ان کی اہم تصانیف میں اولین کارنامہ ''تواریخ عجیب'' (کالا پانی) ہے جسے خودنوشت سوانح کہنا زیادہ بہتر ہوگا حالانکہ یہ کتاب ان کی زندگی کے انہی ۱۸۔۲۰ سال کا احاطہ کرتی ہے جو انھوں نے جزائر انڈمان نکوبار میں قید وبند سے لے کر رہائی تک گزارے۔ اس سے ان کی گرفتاری اور اس سے قبل کے حالات پر بھی تھوڑی بہت روشنی پڑتی ہے۔ پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس کو تاریخی دستاویز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ یہ ایسی معلومات کی حامل ہے جو اس دور کے خصوصاً کالا پانی کے مخفی حالات کو بھی اس انداز سے قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے جیسے سب کچھ قاری اپنی نظر سے دیکھ رہا ہو۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں چار چاند لگ سکتے تھے بشرطیکہ مولانا اس میں ان علمائے حق اور دیگر ہستیوں کا اجمالاً ہی سہی لیکن ذکر کرتے جو وہاں جنگ آزادی کی مجاہدانہ سرگرمیوں ہی کی وجہ سے ان کے ساتھ زیر عتاب تھے یعنی ان کے رفقائے زنداں تھے جیسے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا لیاقت علی خاں الہ آبادی یا افراد طبقۂ اشرافیہ یا ادبا کیونکہ کالا پانی اس دوران ایسی ہستیوں کی موجودگی کی وجہ سے گہوارۂ علم وادب بنا ہوا تھا۔

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

پھر بھی تواریخ عجیب (کالا پانی) بہرحال ایسی کتاب نہیں ہے جسے ''سلاخوں کے پیچھے لکھی گئی کتابوں'' یا تخلیقات پسِ دیوارِ زنداں میں شمار کیا جائے کیونکہ مولانا نے یہ کتاب اپنی رہائی کے بعد ہندستان واپسی پر

ہی ترتیب دی تھی جیسا کہ خود ان کا اعتراف ہے۔

مولانا کی دیگر تصانیف میں ''تاریخ عجیب'' اور سوانح عجیبہ (سید احمد شہید کے حالات) بھی قابل تعریف ہیں۔ تاریخ عجیب میں جزائر انڈمان کی تاریخ ہے۔ معلوماتی لحاظ سے یہ کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب بہ اجازت حکومت مطبع نول کشور نے ۱۸۷۹ء میں چھاپی تھی لیکن اب یہ بہت کمیاب ہے جبکہ سوانح عجیبہ سید احمد شہید بریلوی اور ان کے خلفاء ورفقا کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی ۱۸۹۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ بعد میں بھی دو ایڈیشن شائع ہوئے لیکن اب دستیاب نہیں ہے۔

مولانا کے خاندانی حالات کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں ہیں بجز ان کے جن کا مختصر تذکرہ سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔ رہائی کے بعد یقیناً انبالہ ہی میں انھوں نے بواسطے ذریعۂ معاش مستقل سکونت اختیار کر لی تھی لیکن ان کے افراد خانوادہ کا کیا انجام ہوا یہ نہیں معلوم۔ ان کی پانی پت والی اہلیہ کا مع ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا کیا ہوا؟ یا پھر جو بیوی مع ۸ بچوں کی وہ انڈمان سے سوغات کے طور پر لے کر آئے تھے ان سب کا کیا ہوا۔ سوائے اس کے کہ ان کے ایک فرزند ارجمند یعنی مولوی محمد اسمٰعیل جو انبالہ میں وکالت کرتے تھے وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں شہید ہو گئے تھے؟ کوئی دیگر حوالہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ مولانا کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ''ارمغان احباب'' (رسالہ معارف مارچ ۱۹۳۹ء) کے مطابق وہ غالباً ۱۹۰۵ء میں بہ عمر ۶۸ سال لقمۂ اجل ہوئے۔

ان کا انتقال انبالہ میں ہوا یا تھانیسر میں؟ ان کی تدفین کہاں ہوئی یا ان کا مدفن کہاں ہے؟ بوقت رحلت ان کی سکونت کہاں تھی؟ کیا ان کے مدفن کا کوئی نشان باقی ہے؟ تاریخ کے اوراق تلاش کے باوجود ان سوالات کے جواب نہیں دے پائے، لیکن مولانا کی ہستی کا ایک زندہ جاوید نشان اپنے وجود کے ساتھ تھانیسر میں آج بھی موجود ہے اور وہ ہے مولانا کی حویلی جس میں ان کا خاندان آباد تھا اور وہ خود بھی اسی حویلی میں رہتے تھے۔ پتہ نہیں یہ مرد مجاہد کی بدقسمتی ہے یا پھر اپنے تاریخی پس منظر کے باوجود حویلی بذات خود اپنے حال پر نوحہ خواں رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ مفتی عطاالرحمٰن قاسمی اپنی حالیہ مرتبہ کتاب ''ہریانہ کی تاریخی مساجد'' میں صفحہ ۱۱۹ پر تھانیسر کی مساجد کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حویلی کے بارے میں کیا لکھتے ہیں:

''مسجد چینی والی کے بالمقابل مشرقی جانب ایک حویلی ہے جس میں جھروکے بنے ہوئے ہیں اور یہ حویلی لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی ہے اس حویلی میں مشہور عالم دین اور مجاہد آزادی مولانا محمد جعفر تھانیسری کا خاندان آباد تھا خود مولانا محمد جعفر تھانیسری رحمتہ اللہ علیہ مرحوم بھی اسی حویلی میں رہتے تھے، مگر آج اس حویلی پر ناجائز قبضہ ہے اور اس میں کم وبیش سو گھر آباد ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے مجاہد آزادی کی ذاتی حویلی پر یہ ناجائز قبضہ نہ صرف تکلیف دہ ہے بلکہ سو سالہ اور ڈیڑھ سو سالہ جشن آزادی منانے کے جذبۂ حب الوطنی پر ایک سوالیہ نشان بھی ہے حکومت ہند خاص طور پر حکومت ہریانہ کو اس امر کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہئے اور اس حویلی میں مولانا محمد جعفر تھانیسری کی یادگار میں کوئی ایسا ادارہ قائم کرنا چاہئے جس سے تھانیسر کے باشندوں کو فائدہ پہنچ سکے۔''

یہ ایک افسوسناک حقیقت ضرور ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی آزادی کے لیے مولانا جیسے مجاہدین نے جو سرفروشانہ کارنامے انجام دیے ہیں ان کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی اس کے باوجود ان فدائیوں کی تاریخ کے ابواب گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مقام قابل غور ہے تاکہ ہم اپنا فرض ادا کر سکیں اور گمنام مجاہدین کا جذبۂ ایثار اور سرفروشی کا ایک ایک پہلو آشکارا ہو جائے۔ ہمارا یہی قدم ایسے مرحومین کے لیے بہترین خراجِ عقیدت ہو سکتا ہے جو ہم کو ہمارے فرض سے سبکدوش بھی کر سکتا ہے۔

○○

قابل توجہ

''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' میں مضامین اور دیگر نگارشات بھیجنے والے قلمکار حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے قلمی نام کے ساتھ ساتھ اپنے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات، اپنا بینک پاس بک میں درج نام، مکمل پتہ اور فون نمبر انگریزی میں ضرور لکھیں۔ (ادارہ)